دہشت گردی کے خلاف جنگ:
قیدیوں سے متعلق امریکی پالیسی

تحریر: چارلس جے میک، ڈیوڈ پی فورسیتھ*
ترجمہ وتلخیص: سید مستعین الرحمن

الجیریا کی جنگ میں فرانس کی جمہوری حکومت نے جنگی قیدیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا اور بہت سی ہلاکتوں کا باعث بنی، یوں اسے داخلی اور خارجی سطح پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ الجیریا کے خلاف لڑائی میں اس تشدد یا بدسلوکی نے ممکن ہے فرانسیسیوں کی جیت میں کچھ معاونت کی ہو لیکن بالآخر فرانس نے الجیریا کے خلاف یہ جنگ ہار دی۔ انسانی حقوق کی پامالی کے عمل نے عالمی سطح پر فرانس کے وقار اور ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس تناظر میں آج ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں اس بات کا قوی خدشہ موجود ہے کہ بش انتظامیہ انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے فرانسیسی تجربے کو نہ دہرا بیٹھے۔ اس نے جان بوجھ کر کئی مقامات پر متعدد قیدیوں کے حقوق کی پامالی کا ارتکاب کیا ہے اور اس بات کو یقینی بنانے میں ناکام رہی ہے کہ یہ پامالی صرف اُن خاص قیدیوں تک محدود رہے جو امریکی جمہوریت کے خلاف فی الواقع کوئی حقیقی خطرہ ہو سکتے ہیں۔ اس نے اپنی تفتیشی پالیسیوں پر بھی کسی مستند نظر ثانی کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیا بدسلوکی پر مبنی یہ عمومی پالیسی برقرار رہ سکے گی؟ اور کیا یہ ان متعدد منفی اثرات سے محفوظ رہ سکے گی جس کا تجربہ فرانس کر چکا ہے؟ یہ سب کچھ جاننے کے لیے ایک محتاط تجزیے کی ضرورت ہے۔

---

* ڈیوڈ پی فورسیتھ (David P. Forsythe) اور چارلس جے میک (Charles J. Mach) لنکن میں واقع یونیورسٹی آف نیبراسکا میں سیاسیات کے معروف پروفیسر ہیں۔ زیر نظر مضمون دی جان ہاپکنز یونیورسٹی پریس کے جریدے ''ہیومن رائٹس کوارٹرلی'' کے مئی ۲۰۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

تعارف

امریکہ نے ایک طویل مدت سے خود کو انسانی حقوق کے چیمپئن اور قانون کی حکمرانی کے علمبردار کے طور پر متعارف کروا رکھا ہے۔ حقوق انسانی کو بنیاد فراہم کرنے والے روشن خیال امریکیوں نے بعض ایسے حقوق و فرائض وضع کیے جنہیں مستقبل کے سیاسی ڈھانچے کی بنیاد بننا تھا۔ انہوں نے امریکی نظام سیاست کو دوسروں کے لیے مشعل راہ بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسا نظام جس میں فرد کی آزادی و وقار کا احترام کیا جائے۔ اس خواب کے تحت وسعت پذیر امریکہ کو ایک ایسی سلطنت بننا تھا جو مجسم آزادی (انسانی) ہو۔

بڑھتی ہوئی امریکی طاقت کے ساتھ بتدریج یہ سوچ پیدا ہوئی کہ انسانی حقوق، جمہوریت محض امریکہ کی داخلی ضرورت نہیں بلکہ دنیا میں امن کے فروغ اور ترقی کے لیے ہر جگہ اس کی ضرورت ہے۔ اس سوچ کے زیر اثر، کم از کم تخیلاتی طور پر، دنیا میں جمہوریت کا فروغ امریکہ کا بنیادی مشن قرار پایا۔ اس اندازِ فکر کی جھلک بیسویں صدی کی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف امریکی صدور کی پالیسیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں بیسویں صدی کی بیشتر جنگوں میں امریکہ کی براہ راست یا بالواسطہ شرکت کا تانہ بانہ، شخصی آزادی اور جمہوریت کے فروغ یا فسطائیت، آمریت، استعماری اور اشتراکی نظام کی حوصلہ شکنی سے جوڑا جاتا رہا۔

داخلہ و خارجہ دونوں پالیسیاں اکثر اس انسانی آزادی سے وابستگی کو مقدم رکھتی ہیں جو شہری اور سیاسی حقوق کی بنیاد پر قانوناً حاصل ہیں اور ایسی سوچ کے حامل شخص کو ہی ''امریکن'' سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ اندازِ فکر خواہ تخیلاتی شناخت رکھتا ہو یا عملی، امریکہ میں اسے دنیاوی مذہب کا درجہ حاصل ہے۔

شہری اور سیاسی حقوق پر قائم امریکہ کا تصورِ امتیازیت ہمیشہ حقیقت سے زیادہ خیال آرائی پر مبنی رہا ہے مثلاً اس تصور کے بہت سے بانیوں کے پاس غلام تھے اور غلامی کے شعبے کو ختم کرنے کے لیے ان لوگوں نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ خود امریکہ مغربی دنیا میں شعبۂ غلامی سے نجات پانے والے آخری چند ممالک میں سے ایک تھا۔ افریقی امریکیوں سے امتیازی رویہ روا رکھنے کا معمول بالخصوص جنوبی امریکہ میں ۱۹۶۰ء تک قائم رہا۔ دوسری جانب شمالی امریکہ میں ''مظہر تقدیر'' (Manifest Destiny) کا امریکی

تصور مقامی امریکیوں کی نسل کشی نہیں تو کم از کم نسلی بے دخلی کا رواج پا جانے پر قائم ہوا تھا۔ ۱۹۲۰ء تک خواتین کے ساتھ سیاسی امتیاز برتا گیا جبکہ اس سے پہلے اور آنے والے کئی برسوں تک یہ امتیازی سلوک کئی دوسری صورتوں میں برقرار رہا۔ مزدوروں کے حقوق کی آواز کو کچلا گیا، جنوبی یورپ، ایشیا، وسطی امریکہ اور دیگر کئی جگہوں سے آئے ہوئے باشندے نہ صرف امتیازی سلوک بلکہ تعصب کا نشانہ بنتے رہے۔ کیتھولک اور یہودی اکثر پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کے مظالم کا نشانہ بنے۔ شہری آزادی پر حملے، سیاسی عدم برداشت کے خلاف مذہبی تنگ نظروں کی محاذ آرائی بھی امریکی معاشرے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم جنس پرستوں کی یہی روش زمانۂ جدید میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا باعث بنی۔

کچھ لوگوں کے خیال میں قوانین اور حقوق کی پاسداری کے امریکی تخیل کا موازنہ بعض ایسی حکمت عملیوں کی حقیقت سے کیا جائے جو ظلم کے حوالے سے افراط و تفریط پر مبنی ہیں تو منافقانہ پن کی ایسی عظیم مثال ملتی ہے جس کی شاید ہی کسی دوسرے ملک سے توقع کی جا سکے۔ جبکہ بعض لوگوں کے خیال میں درحقیقت حقوق اور آزادی کی ان صورتوں (جنہیں حکومتی حمایت حاصل ہے) کی روشنی میں یہ موازنہ کیا جائے تو ایک مثالی ریاست کی طرف پیش قدمی جاری رکھنے کے لیے اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کا ایسا عزم ابھر کر سامنے آتا ہے جس کا مقابلہ شاید ہی کسی دوسرے ملک سے کیا جا سکتا ہو۔

فرضی عدم تحفظ کی فضا میں انسانی حقوق پر عموماً ضرب پڑتی ہے۔ اگر جنگ کے لیے سچ کو قربان کر دیا جائے تو انسانی حقوق بھی کہیں قریب ہی زندگی کے آخری سانس لے رہے ہوتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمن مختلف حوالوں سے زیرعتاب آئے، دوسری جنگ عظیم میں (جاپانی نژاد) امریکیوں کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اسی طرح ویت نام کی جنگ سے لوٹنے والوں کے لیے تلخ جذبات کا پایا جانا بھی بہت معروف ہے۔ پھر ۲۰۰۴ء کے صدارتی انتخابات کی دوڑ نے جان کیری کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کے اثرات بڑے گہرے اور وسیع ہوتے ہیں خواہ یہ حکومت کی ناقص حکمت عملیوں ہی کے باعث کیوں نہ ہو۔

قول و فعل کا واضح تضاد اور محض احساسِ عدم تحفظ کی بناء پر اخلاقی اقدار سے انحراف امریکی قومی زندگی کے وہ دو اہم پہلو ہیں جو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے دہشت گرد حملوں کے بعد امریکی خارجہ پالیسی پر کی جانے

والی بحث کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یہ مضمون جنگی قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے طرزِ عمل سے متعلق امریکی پالیسیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ موضوع بالخصوص (اس حقیقت کے باوجود کہ عوام اور کانگریس کے بیشتر اراکین اس معاملے میں (۲۰۰۵ء کے اواخر تک) اتفاقِ رائے رکھتے ہیں)، دنیائے اسلام اور امریکہ میں انسانی حقوق کے علمبرداروں کے لیے یقیناً بڑی توجہ کا حامل ہے۔

قانون کے سائے میں پنپنے والی انسانی حقوق کے ساتھ امریکہ کی قولی وابستگی کس حد تک اس کی ان عملی حکمت عملیوں پر اثر انداز ہوسکی ہے جو وہ گوانتاناموبے، افغانستان، عراق کے خفیہ قید خانوں اور بہت سے دوسرے ملکوں میں بنائے گئے امریکی زندانوں میں اسیر نام نہاد دشمن قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لیے اپنائی گئی ہیں، یہ خود اپنی جگہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ امریکی ذمہ داران نے کس حد تک متاثرین جنگ کے لیے ۱۹۴۹ء میں وضع کیے گئے جنیوا کنونشن اور اذیت اور بدسلوکی کے خلاف اقوام متحدہ کے کنونشن کا لحاظ کیا ہے؟ کیا ہمیں اس معاملے سے نمٹنے کے لیے امریکی حکمت عملیوں میں قول وفعل کا وہی تضاد نظر آتا ہے جو باقی معاملات میں دکھائی دیتا ہے؟ کیا ہمیں قومی عدم تحفظ کی فضا میں انسانی حقوق کے معاملہ میں ویسی ہی کج روی نظر آتی ہے، اور یہ جان لینے کے بعد کہ قیدیوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے خلاف بین الاقوامی سطح پر سامنے آنے والی قابل ذکر تنقید کے بعد کیا بش انتظامیہ اس پالیسی پر قائم رہ سکے گی؟ ہم آئندہ صفحات میں اس کا جائزہ لیں گے۔

بش پالیسی کی حقیقت

دشمن قیدیوں سے بدسلوکی اور دہشت گردی کے استعمال کی افادیت کے بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں اور کسی بیرونی تجزیہ نگار کے لیے یہ جاننا ممکن نہیں کہ اس میں سے کون سی رائے زیادہ درست ہے۔ پہلی رائے کے مطابق قیدیوں سے بدسلوکی کا رویہ بعض قیمتی معلومات کی فراہمی کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کی مثال الجیریا کے خلاف جنگ میں فرانس کی حاصل کردہ معلومات ہیں۔ اس کے برعکس دوسری رائے کے مطابق قیمتی معلومات اگلوانے کے لیے قیدی اور پوچھ گچھ کرنے والے کے درمیان دوستانہ ماحول بہتر نتائج فراہم کرتا ہے۔ پہلی رائے کے حامی لوگوں میں مرکزی خفیہ پولیس کے ادارے (سی آئی

اے) اور خصوصی کارروائی کے لیے مختص فوجی دستوں کے اہلکار اور بعض دیگر حلقے شامل ہیں جبکہ دوسری رائے کی حمایت کرنے والوں میں باوردی فوجی قواعد وضوابط بنانے والے حضرات شامل ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کے آغاز سے ہی صدر بش اور ان کے قریبی رفقاء نے، جن میں نائب صدر ڈک چینی، وزیر دفاع رمز فیلڈ اور قانونی مشیر شامل تھے، پہلی رائے کو دوسری پر ترجیح دی۔ انہیں بنیادی طور پر محکمہ انصاف نے ایسا کرنے سے روکا جبکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور قومی سلامتی کونسل کے اہلکاروں، بشمول قومی سلامتی کونسل کی مشیر کونڈالیزا رائس کو ابتدائی مشاورت میں بظاہر شامل ہی نہیں کیا گیا۔ یہی حال فوجی وکلاء کا بھی تھا۔ جن وکلاء کی خدمات حاصل کی گئیں ان کی تعیناتی سیاسی طور پر کی گئی تھی جو غالباً اپنے مؤکلوں کو قانون شکنی کے قانونی طریقے سکھانے (جیسے غیر اخلاقی کاموں) کے لیے رکھے گئے تھے۔

بش انتظامیہ نے فرضی جنگ کا اعلان کرتے ہوئے یہ باور کرایا کہ ان حالات میں معمول کے قواعد وضوابط اور جانچ پڑتال کے طور طریقوں کا اطلاق نہیں ہوتا اور اس بنیاد پر بہت سے قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ اس مؤقف کی تائید میں نائب صدر ڈک چینی اور سی آئی اے کے سابق افسر کوفر بلیک (Cofer Black) نے بھی اپنی آواز شامل کرتے ہوئے قیدیوں سے تشدد آمیز سلوک کو امریکہ اور امریکی عوام کے وسیع تر مفاد میں قرار دیا۔

قانونی بندشوں کو بے اثر بنانے کی کوشش

۱۔ اس ضمن میں پہلا قدم یہ تھا کہ قیدیوں سے تشدد آمیز پوچھ گچھ کے عمل میں حائل قوانین کو کسی طرح بے اثر بنا دیا جائے اور اس کام کو انجام دینے والوں کو قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلا دعویٰ تو یہ کیا گیا کہ جنیوا کنونشن کے نام سے معروف عالمی قانون برائے انسانیت (IHL) کا اطلاق گوانتاناموبے یعنی کیوبا (کیوبا) میں واقع امریکی بحری اڈے پر نہیں ہوتا۔ یہ بحری اڈا امریکہ نے کیوبا سے ہمیشہ کے لیے اُدھار (lease) لے لیا ہے جس کا انتخاب سوچ کر کیا گیا تھا کہ یہاں پر ہونے والی سرگرمیاں امریکی عدالتوں کے قانونی دائرہ اختیار سے باہر ہوں گی۔ انتظامیہ نے نہ

صرف طالبان حکومت کی طرف سے لڑنے والوں (بلکہ ان قیدیوں کو بھی جو بہت سی مسلح جھڑپوں میں شامل تھے)، کو اس عالمی قانون برائے انسانیت کا قانونی تحفظ فراہم کرنے سے گریز کیا۔ امریکہ کا یہ موقف جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی ہے کیونکہ اس کا اطلاق اسلحے سے لیس کسی بھی طرح کی جھڑپ پر ہوتا ہے چاہے کسی حکومت یا علاقے کو دنیا نے تسلیم کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۔ بش انتظامیہ نے تشدد کے خلاف اقوام متحدہ کے کنونشن کی ایسی تعبیرات کیں جن کے باعث یہ بے معنی ہو کر رہ گیا۔ مثلاً جنگی قیدی کو شدید چوٹ پہنچانے کی ممانعت (خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی)، کا مفہوم یہ اخذ کیا گیا کہ جب تک قیدی کا کوئی عضو ناکارہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہر تشدد جائز ہے۔ اسی طرح اگر پوچھ گچھ کرنے والے کی نیت میں تشدد شامل نہیں تھا، تو ہونے والے کسی درد یا تکلیف کو تشدد تصور نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ تاویلات جب عوام تک پہنچیں اور اس کا شدید ردعمل سامنے آیا تو انہیں واپس لے لیا گیا تاہم اس سے بش انتظامیہ کے اصل مقاصد پوری طرح واضح ہو گئے۔

۳۔ ایسی یادداشتیں رقم کی گئیں جس کے تحت زمانۂ جنگ میں قوم کی حفاظت کے لیے صدر کو غیر محدود اختیارات سونپ دیے گئے۔ یہاں تک کہ بعض صورتوں میں قومی قوانین کا قابلِ اطلاق ہونا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔

۴۔ قیدیوں کو زبردستی غائب کر دینے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔ یعنی امریکی حکام قیدیوں کو کسی خفیہ جگہ اپنی تحویل میں رکھتے تھے لیکن سرکاری طور پر اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا تھا تاکہ کوئی قانون ان قیدیوں کو تحفظ فراہم نہ کر سکے۔

۵۔ بعض قیدیوں کو کسی قانونی ضابطے کے بغیر ایسے ممالک میں بھیج دیا جاتا جو اپنے سخت رویے کی وجہ سے مشہور ہیں مثلاً مصر وغیرہ۔ پھر ان ممالک کو یقین دہانی کروادی جاتی تھی کہ تشدد کے خلاف قانون کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا۔ اس معاملے پر غور وخوض کے بجائے بش انتظامیہ نے ان حکمت عملیوں پر تیزی سے عمل کروایا تاکہ امریکی عدالتوں کو قانونی تقاضوں کے مطابق کارروائی کرنے کا موقع ہی فراہم نہ ہو سکے۔

ان کارروائیوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلی آتی رہی مثلاً مارچ ۲۰۰۳ء میں عراق پر قبضہ کے بعد صدر بش

نے اسے بین الاقوامی جنگ تسلیم کر لیا جس پر عالمی قوانین برائے انسانیت (International Humanitarian Law) کا اطلاق ہوتا ہے۔ بش انتظامیہ کا اب تک اس بات پر اصرار رہا ہے کہ عالمی قوانین برائے انسانیت اور اس سے متعلقہ ادارے کی بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ یہ امریکہ کی مثبت پالیسیوں کے خلاف تھے لہٰذا بش انتظامیہ نے عالمی قوانین برائے انسانیت کو ختم کروانے کی بھرپور کوششیں کیں۔

پرتشدد پوچھ گچھ کی ترویج

رمزفیلڈ نے گٹمو (Gitmo) سے حاصل شدہ معلومات کو ناکافی قرار دیا جو بریگیڈیئر جنرل رک بیکس (Rick Baccus) اور میجر جنرل مائیکل ڈن لیوی (Michael Dunleavey) کے زیرِ انتظام دی جا رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے میجر جنرل جیفری ملر (Geoffery Miller) کو مطلوبہ تبدیلیاں لانے کے لیے روانہ کیا۔ ملر نے سخت رویہ اپنایا اور ملٹری پولیس کو ہدایات دیں کہ وہ قیدیوں سے پوچھ گچھ کے دوران ویسی ہی سختی کرے جیسی خفیہ فوجی ادارہ کرتا ہے۔ ادھر رمزفیلڈ نے پوچھ گچھ کو موثر بنانے کے لیے امریکی عسکری پولیس کے فرائض، قواعد وضوابط اور آزمائشی حربوں کے سلسلے میں تفصیلی ہدایات جاری کیں جبکہ سی آئی اے (وفاقی ادارہ برائے تحقیقات) اور ایف بی آئی کی ہدایات یقیناً اس سے مختلف تھیں۔ امریکہ کے لیے گٹمو کا بنیادی مقصد جاسوسی میں مدد اور قیدی رکھنے کی جگہ فراہم کرنا تھا۔ ابتداء میں قانونی تقاضوں کی بجا آوری کا معاملہ واشنگٹن تک محدود رہا تاوقتیکہ امریکی عدالتوں میں یہ معاملہ زیرِ بحث آ گیا۔

رمزفیلڈ کے بعض مخصوص مقاصد (جو چند قیدیوں سے انتہائی اہم اور خفیہ اطلاعات اگلوانے سے متعلق ہو سکتے ہیں) سے قطع نظر ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۴ء کے درمیانی عرصے میں گٹمو کے قیدیوں پر انتہائی تشدد ہوا۔ اس بات کا علم ریڈ کراس کی عالمی کمیٹی کی وساطت سے ہوا جو غالباً اعلیٰ امریکی حکام کے ذرائع سے منظرِ عام پر آئیں۔ اسی طرح ایف بی آئی کی یادداشتوں پر مبنی بعض حقائق کا انکشاف ہوا جن تک بعض غیر حکومتی اداروں کی رسائی ہو چکی تھی، پھر بعض کتابیں بھی منظرِ عام پر آئیں اور بالآخر رہا ہونے والے متعدد

قیدیوں نے مبینہ بدسلوکی کے دعوے بھی کیے۔

کچھ قیدیوں کو مذہبی اور جنسی طور پر ستایا گیا، ان کی تذلیل کی گئی، تکلیف دہ حالت، یعنی شدید سردی اور شدید گرمی میں رکھا گیا، چنگھاڑتی آوازوں، شور اور تیز روشنی میں رہنے پر مجبور کیا گیا، قیدِ تنہائی سے گزارا گیا، زبردستی چیزیں پلائی جاتیں اور اپنے آپ پر پیشاب کرنے پر مجبور کیا جاتا، ان پر فوجی کتے چھوڑے گئے۔ غرض ان کو اسی تشدد آمیز رویے سے گزارا گیا جس سے اسرائیل نے مشرق وسطیٰ میں فلسطینی قیدیوں کو گزارا تھا اور جیسا انگریزوں نے اپنے وقت میں شمالی آئرلینڈ کی عبوری انتظامیہ کے ممبران سے بدسلوکی کی تھی۔ پوچھ گچھ کے اس انداز کو دیکھتے ہوئے سی آئی اے اور ایف بی آئی نے خود کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی، اگرچہ سی آئی اے یہی کچھ دوسری جگہوں پر کرنے کی شہرت رکھتی ہے، تاہم گٹمو میں انہوں نے اپنے آپ کو اس بدسلوکی سے دور رکھا۔

۲۰۰۳ء کے موسم بہار میں جب امریکی افواج نے عراق پر یلغار کی تو انہیں کثیر تعداد میں قیدی ملتے گئے۔ جبکہ اس عرصے میں عراقیوں کی طرف سے امریکی افواج کو شدید مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ ان حالات میں قیدیوں سے متعلق امور انجام دینے کے لیے ان کے پاس مطلوبہ تربیت یافتہ اسٹاف کی کمی ہوگئی۔ چنانچہ گٹمو سے جنرل ملر کو اگست میں عراق بھجوا دیا گیا تاکہ وہ قیدیوں کی اس کثیر تعداد سے نمٹنے کا کام انجام دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق میں بھی گٹمو کے قیدیوں والی بدسلوکی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ امریکی فوج کی مرکزی کمان کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل ریکارڈو سانچیز (Ricardo Sauchez) نے خود بدسلوکی روا رکھنے کی بعض تکنیکوں سے متعارف کرایا۔ یہاں بھی سی آئی اے نے خود کو اس سے الگ رکھا۔ ۲۰۰۴ء میں بعض تصاویر کی اشاعت سے قیدیوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کوئی راز نہ رہ سکی۔ پھر گٹمو کے برعکس بدسلوکی کے نتیجے میں یہاں کچھ اموات کی رپورٹ بھی پیش کی گئیں۔

۲۰۰۱ء سے افغانستان سے قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی خبریں تسلسل کے ساتھ آ رہی تھیں۔ عراق کی طرح یہاں پر کیا جانے والا تشدد بھی جان لیوا ثابت ہوا۔ آخر کار امریکی فوج کی باقاعدہ رپورٹ کے مطابق عراق اور افغانستان میں امریکی تحویل میں رکھے گئے قیدیوں میں سے کم و بیش ۳۰ افراد کی موت واقع ہوئی۔ رہا کیے جانے والے قیدی بھی عموماً وہی شکایت کرتے تھے جن کی تصدیق ذرائع ابلاغ سے بھی

ہوتی ہے۔

جبری اور تشدد آمیز پوچھ گچھ کے عمل نے عالمی قوانین برائے انسانیت کی متعدد شقوں کی خلاف ورزی کی اور امریکی آئین کے بعض حصوں خصوصاً آٹھویں ترمیم سے متعلق ہدایات کو، جو ظالمانہ اور غیر معمولی سزاؤں سے روکتی ہیں، کو نظر انداز کیا گیا۔ تاہم امریکہ کی عدالتوں نے تا حال ان کی توثیق نہیں کی۔

انتقامی پالیسیوں کا تحفظ

ابتداء میں صدر بش بار بار قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی یقین دہانی کرواتے رہے لیکن یہ سب کچھ بے معنی تھا۔ انہوں نے قیدیوں کے ساتھ جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک کرنے کی ضمانت دیتے ہوئے فوجی ضرورتوں کا حوالہ بھی دیا۔ گویا دوسرے الفاظ میں فوجی ضرورت کے تحت یہ سلوک ترک کر دیا جائے گا۔ یوں اچھے سلوک کے بجائے اہمیت ظاہر ہے فوجی ضرورت کو حاصل رہی، کون جانتا تھا کہ فوجی ضرورت کب پیش آ جائے؟ اس کا فیصلہ تو فوجی قائدین خود ہی کر سکتے ہیں!!

امریکی انتظامیہ کے دیگر بیانات میں بھی قیدیوں سے بہتر سلوک کی یقین دہانی کروائی جاتی رہی لیکن بھاری تشدد سے اجتناب کے علاوہ انتظامیہ نے کبھی تشدد کی تعریف واضح نہیں کی کہ ان کی نظر میں تشدد کیا ہے؟ اور ہلکے تشدد سے بھی اجتناب برتا جائے گا یا نہیں؟ بش انتظامیہ نے ان وضاحتوں پر بھی کوئی کان نہ دھرا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ہلکا تشدد بھی عالمی قوانین برائے انسانیت کی روشنی میں ممنوع ہے۔ گٹمو میں قیدیوں کے ساتھ جو بدسلوکی متعدد مصدقہ ذرائع کے حوالے سے منظر عام پر آئی، انتظامیہ کے ترجمانوں نے ان کا بھی انکار کرتے ہوئے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا۔ پھر ۲۰۰۵ء میں سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے بیسویں ہائی جیکر محمد القحطانی کے خلاف بدسلوکی ثابت ہوگئی تو رمز فیلڈ نے تفتیش کی نوعیت سے تو انکار نہیں کیا لیکن یہ کہا کہ یہ تفتیش ماہرین کی کڑی نگرانی میں ہو رہی تھی۔ گویا محدود یا خصوصی طور پر ہی سہی، مگر پُر تشدد پوچھ گچھ کے عمل کا اعتراف ضرور سامنے آ گیا۔ اور یہ تشدد امکانی طور پر ہلکا تھا جسے غالباً قانونی تحفظ بھی حاصل تھا۔ تشدد اور بدسلوکی کو قابل قبول سمجھنے والوں کے خیال میں اس تفتیش کو

قانونی تحفظ حاصل ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں بہت سی جانیں بچانے والی معلومات اکٹھی کی گئی تھیں لیکن یہ دلائل سیاسی جواز تو مہیا کر سکتے ہیں، قانونی نہیں!!

گٹمو، افغانستان اور عراق میں امریکی فوج نے مختلف نوعیت کے افراد کے خلاف فوجداری کے دعوے دائر کیے جن میں اکثریت کم درجے کے فوجیوں کی تھی۔ ان میں کافی لوگوں کو انتظامی بنیادوں پر چھوٹ مل گئی جن میں بعض سینئر رینک کے افسر بھی شامل تھے۔ جبکہ ریزرو فوجیوں میں سے ایک بریگیڈیر جنرل جینس کارپنسکی (Ganis Karpinski) بھی بری کیے جانے والوں میں شامل تھا، حالانکہ اس نے بیان دیا تھا کہ عراقی قیدیوں کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کے لیے اسے اعلیٰ افسران نے مجبور کیا تھا۔ جب جبری تفتیش کا دائرہ قیدیوں کی کثیر تعداد تک پھیلا دیا گیا یا اس کی منفی تشہیر ہونے لگی تو امریکہ نے کبھی کبھار اپنے فوجی افسران کے خلاف بھی الزامات عائد کیے۔ لیکن کارپنسکی اور پیپس (Pappas) کے علاوہ اور کسی سینئر افسر کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ نجی تفتیش کار جو کسی معاہدے کے تحت کام کر رہے تھے یا سی آئی اے اور ایف بی آئی کے ایجنٹس کا کردار منظر عام پر نہیں آ سکا۔

اس کے ساتھ ہی انتظامیہ نے واضح کر دیا کہ قیدیوں سے بدسلوکی کی انکوائری کا سلسلہ سینئر افسروں تک نہیں پہنچے گا۔ ابوغریب جیل سے تصاویر برآمد ہونے کے بعد سیکرٹری دفاع کی طرف سے کئی تحقیقاتی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاہم یہ افغانستان اور گٹمو کے بجائے عراق تک محدود رہیں۔ فوجی انکوائریاں اس طرح ترتیب دی گئیں کہ یہ توجہ کا مرکز ہٹانے میں مددگار ہوں اور سیکرٹری دفاع اور وائٹ ہاؤس بھی تبصروں اور تنقید سے بچے رہیں۔ ایک آزاد کمیٹی جو قومی سلامتی کے سابق ممبران پر مشتمل تھی، مثلاً جیمس شلیز نجر (James Schlesinger)، سابق سیکرٹری دفاع وغیرہ نے قیدیوں سے بدسلوکی کے معاملے میں انفرادی اور محکمہ جاتی سطح پر بعض اعلیٰ شخصیات کو ذمہ دار قرار دیا تاہم ان ذمہ داران کے نام بتانے سے انکار کر دیا۔ وائس ایڈمرل البرٹ چرچ سوئم (Albert Church-III) کی طرف سے بعد میں آنے والی رپورٹ منظر عام پر نہیں آ سکی۔ تاہم اس کے ظاہر کردہ نکات کے مطابق عراق میں تمام اعلیٰ فوجی افسروں کو بدسلوکی کے الزام سے بری کر دیا گیا۔

صدر بش ان تمام لوگوں کو آگے لائے جنہوں نے قیدیوں سے متعلق پالیسی بنانے میں اہم کردار ادا

کیا تھا۔ انہیں محکمہ انصاف کے اعلیٰ عہدوں کے لیے نامزد کیا گیا۔ اسی طرح رمز فیلڈ کے استعفے کو بھی صدر نے منظور نہیں کیا۔

داخلی ردعمل

امریکی معاشرے اور ری پبلکنز کی اکثریت نے کانگریس کے دونوں ایوانوں میں ۲۰۰۲ء تک کے عرصے میں جنگی قیدیوں سے متعلق صدر بش کی حکمت عملی پر کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ یہی وہ المیہ ہے جس کا تذکرہ سارتے (sartre) نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں کیا تھا کہ یہ سوال بڑا پریشان کن ہے کہ جب ہم وطن ہی ناخن اتارنے جیسے غیر انسانی کاموں کی حمایت کریں تو اس صورت حال میں کیا کیا جائے؟ یہ بڑا اذیت ناک سوال ہے کہ قوم کے تحفظ کی خاطر کس حد تک چند لوگوں کے ساتھ بُرا سلوک کرنا جائز ہے؟ (اور یہ کہ چند افراد کسی سپر پاور کے لیے کیسے خطرناک ہو سکتے ہیں جسے ناقابل شکست ہونے کا دعویٰ بھی ہے)۔

مقامی سطح پر کوئی قابلِ ذکر عوامی احتجاج سامنے نہیں آیا۔ لیکن شاید یہ باعثِ حیرت نہیں کیونکہ نسل کشی کے معاملے میں بھی امریکی عوام نے اپنی خارجہ پالیسی کے ذمہ داران سے کوئی جواب طلبی نہیں کی تھی۔ آخر امریکی شہریوں سمیت پورے ملک پر حملہ ہوا تھا! پھر آزاد معاشروں کا المیہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنے نجی معاملات میں غیر ضروری طور پر الجھے رہتے ہیں جن میں گھریلو امور، ملازمتیں، اسکول، صحت، پنشن اور اس طرح کے اور بہت سے معاملات شامل ہیں۔ مائیکل اگناتیف (Michael Ignatieff) کے خیال میں جمہوری معاشروں میں متوسط طبقہ ہی شہری آزادیوں کے مقابلے میں قومی دفاع کو ترجیح دیتا ہے۔

کانگریس میں موجود ری پبلکنز بھی ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے قومی ردعمل کے زیر اثر اپنے صدر کو ایک تجزیاتی نظر ڈال لینے کا موقع فراہم کرنے میں پس وپیش سے کام لے رہے تھے۔ چند کچہریاں سجائی گئیں مگر فوجی افسر بچا لیے گئے، سخت سوالات سے گریز کیا گیا اور معاملہ کانگریس کے پائیدان کی زینت بن کر رہ گیا۔ پھر محکمہ انصاف کے اعلیٰ عہدوں کے لیے کانگریس نے ان تمام افراد کی توثیق کر دی جن کا نام صدر بش نے

تجویز کیا تھا اور جنہوں نے قیدیوں سے متعلق پالیسی بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ ان میں گونزیلس (Gonzales) کو اٹارنی جنرل کا عہدہ دیا گیا اور اور جے بی بائی (Bybee) نویں سرکٹ کورٹ اپیل کے جج بنا دیے گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے عراق میں جنگ جاری رکھنے کی امریکی حمایت میں کمی واقع ہوئی اور مختلف معاملات میں صدارتی توثیق کا تناسب گرنے لگا ویسے ویسے بعض ری پبلکنز سمیت کانگریس کے چند اراکین، گٹمو کو بند کر دینے اور قیدیوں کے بعض امور کے متعلق بولنے لگے۔ یہ وہ موقع تھا جب بعض ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس میں قیدیوں سے متعلق حکمت عملی کے بارے میں بے چینی محسوس کی گئی۔ خصوصاً سینیٹ میں جہاں ری پبلکنز سینیٹر جان میکین (John McCain)، لنڈسے گراہم (Lindsay Graham) اور جان وارنر (John Warner) سرگرم اراکین میں شامل تھے اور اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ امریکی فوجی برتری بھی قائم رہے اور بین الاقوامی معیار سے کوئی سمجھوتہ بھی نہ کیا جائے۔ اس طرح واضح طور پر پہلی بار بش کی حکمت عملیوں کی نفی دیکھنے میں آئی۔

اس وسیع بحث کے تناظر میں سینیٹ نے ۹ کے مقابلے میں ۹۰ ووٹوں سے اس تفتیشی طریقہ کار کی مخالفت کی جو امریکی فوج کے قواعد وضوابط سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بل ری پبلکن کی اکثریت والے ہاؤس میں بآسانی منظور ہو گیا۔ جب بش انتظامیہ اس معاملے کو سلجھانے میں ناکام رہی تو صدر نے متعلقہ قانون پر دستخط تو کر دیے لیکن ساتھ ہی ایک دستخطی بیان جاری کیا جس نے اس سوال کو جنم دیا کہ آیا وہ تمام صورتوں میں اس قانون کا وہی سادہ مفہوم اخذ کریں جیسا کہ اس کے الفاظ بتاتے ہیں؟ گویا اس سوال میں سینیٹر میکین اور ان کے ہم خیال افراد (جو اس قانون سازی کا محرک بنے تھے) کی رائے میں پرتشدد تفتیش کی قطعی ممانعت ہونی چاہیے جبکہ صدر کے دستخطی بیان میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ کبھی غیر معمولی صورت حال پیش آ جائے تو اس وقت کی مجاز انتظامیہ خود مناسب فیصلہ کر سکتی ہے۔

تفتیش کے لیے معروف انسانی اصولوں کے حق میں اتفاق رائے ہو جانے کے باوجود یہ معاملہ خاصا حساس نوعیت کا ہے۔ جب سینیٹر رچرڈ ڈربن (Richard Durbin) نے سرعام قیدیوں سے روا رکھے گئے امریکی سلوک کا موازنہ نازیوں سے کرنا چاہا تو انتظامیہ اور کانگریس کے ری پبلکنز دونوں کی

جانب سے ایسا شدید حملہ ہوا کہ انہیں معذرت کرنا پڑی۔ پھر کانگریس کے بعض اراکین گٹمو گئے لیکن یہ مفید ثابت نہ ہوا اور یہ کہا گیا کہ ایسے مواقع پر دکھلاوے کے لیے بہت سی سرگرمیاں حقائق تک پہنچنے میں مدد نہیں دیتیں۔

قومی ذرائع ابلاغ میں ''نیویارک ٹائمز'' نے اس معاملے پر توجہ دلائے رکھی تاہم بش کی حکمت عملیوں کے تحفظ کے لیے دیگر متعدد ذرائع بھی کم نہیں تھے۔ اسی طرح بعض آزاد ذرائع اور غیر حکومتی اداروں نے اس اعتبار سے اہم کردار ادا کیا کہ اطلاعات تک رسائی کی آزادی کے قوانین کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے ایف بی آئی کی یادداشتیں اور قیدیوں سے کی جانے والی بدسلوکی سے متعلق اہم دستاویزات کے مطالعے اور مشاہدے کو عوامی حلقوں کے لیے بہت آسان بنا دیا۔ دوسری جانب انسانی حقوق کی بعض انجمنوں نے قیدیوں کی طرف سے سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی سبیل پیدا کر دی۔ غرض یہ کہ امریکی معاشرے کے مختلف طبقوں کی طرف سے اپنے اپنے میلانات کی روشنی میں ردعمل سامنے آتا رہا۔

سیاسی میدان میں ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے مؤثر تنقید سامنے نہیں آئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ۲۰۰۴ء کے صدارتی انتخابات میں وہ قومی دفاع کے معاملے میں نرم گوشہ دکھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسری جانب بش انتظامیہ کی حکمت عملی کے متبادل کوئی حکمت عملی تیار نہیں کر سکے چنانچہ قیدیوں سے بدسلوکی کا معاملہ صدارتی انتخاب کی دوڑ میں سامنے لایا ہی نہیں گیا۔ اس سیاسی تناظر میں امریکی عدالتیں بتدریج اور محتاط انداز میں سرگرم ہوتی گئیں۔ پہلے عدلیہ کا موقف یہ تھا کہ گٹمو میں ہونے والی سرگرمیاں ان کے دائرہ اختیار میں آتی ہیں، بعد میں اس دعوے کا تجزیہ پیش کیا جانے لگا کہ ملزموں کی بازیابی کا قانون یہاں قابل اطلاق ہے ہی نہیں! اس قانونی فضا میں انتظامیہ ڈٹ گئی اور ہر قانونی نکتے پر تکرار ہوتی چلی گئی۔ بش انتظامیہ نے آہستہ آہستہ فوجی عدالتیں قائم کر دیں تاکہ متحارب دشمن پر مقدمات قائم کیے جا سکیں۔ یہ عدالتیں انتہائی متنازعہ طریق کار کے مطابق کام کر رہی تھیں۔ قیدیوں کے وکلاء کی جانب سے جارحانہ دفاع نے اس عمل کو مزید سست بنا دیا اور وفاقی عدالتوں کی طرح فوجی عدالتیں بھی کم از کم اس مضمون کی اشاعت تک اس معاملے کو نمٹانے میں زیادہ موثر ثابت نہ ہو سکیں۔

بین الاقوامی ردعمل

یہ بات بڑی واضح ہے کہ جنگی قیدیوں سے متعلق بش کی حکمت عملی نے عرب اور مسلم دنیا میں انتہائی منفی اثرات مرتب کیے۔ پھر ظاہر ہے تمام یورپی ممالک کے عوام نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور دیگر متعدد ممالک میں بھی اسے سخت تنقیدی نقطۂ نظر سے جانچا گیا جو ویسے بھی امریکہ کی پھیلتی ہوئی لامحدود قوت سے خائف ہیں۔ بعض عراقی باغیوں کے ہاتھ قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی والی تصاویر لگ گئیں جس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ یوں قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھے جانے کی بدنامی کے حوالے سے امریکہ کو دنیا میں اپنا کردار نبھانا مشکل ہو گیا۔ تاہم برطانیہ، سویڈن، کینیڈا اور بعض دیگر ممالک کی حکومتیں چونکہ امریکہ کی شریک کار تھیں، لہٰذا گٹمو میں قیدیوں کے ساتھ برتی جانے والی حکمت عملی میں ان ممالک کی معاونت بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ عوامی سطح پر منفی رائے کے باوجود بعض حکومتوں کی ہمدردیاں امریکہ کے ساتھ ہی رہی ہیں۔

اس موضوع پر اقوام متحدہ کا ردعمل مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا لیکن بطور مجموعی اقوام متحدہ بش انتظامیہ پر بہت کم اثر انداز ہو سکی، کیونکہ اقوام متحدہ کی وہ ہدایات جو امریکی حکمت عملیوں کے خلاف ہوتی تھیں انہیں بآسانی نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور ویسے بھی یہ بات معروف ہے کہ واشنگٹن پر اقوام متحدہ کی طرف سے ہونے والی تنقید کو اتنا سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا جتنا کانگریس کی تنقید یا امریکی عدالتوں کی طرف سے ہونے والی کارروائی کا معاملہ اہمیت رکھتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کی جانب سے قیدیوں کے ساتھ ہونے والی امریکی بدسلوکی کے حوالے سے متعدد بیانات جاری ہوئے لیکن واشنگٹن پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے حوالے سے اپنے بعض ماہرین کو مختلف جیلوں کا جائزہ لینے کے لیے بھجوانا چاہا، جہاں قیدیوں سے بدسلوکی کی خبریں آ رہی تھیں۔ ۲۰۰۴ء سے اقوام متحدہ کی طرف سے کی گئی درخواست تاخیری حربوں کا شکار بنتی رہی پھر بالآخر گٹمو جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن قیدیوں سے انٹرویو کرنے کی اجازت پھر بھی نہیں ملی۔ ان شرائط کے پیش نظر اقوام متحدہ کے متعلقہ ماہرین نے

جانے سے انکار کر دیا۔

انسانی حقوق سے متعلق مختلف بین الاقوامی اداروں نے اس معاملے کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان سب کا تذکرہ ممکن نہیں چند مثالیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی نومبر ۲۰۰۴ء کی رپورٹ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو بہت متنازعہ قرار پائی اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے گوانتاناموبے، کیوبا کے علاقے میں واقع جیل ''گٹمو'' (Gitmo) کو لفظ "gueag" سے تشبیہہ دی (یہ سوویت یونین کے مرکزی انتظامی ادارے کا نام ہے، جو قیدیوں کے معاملات نمٹاتا تھا اور اپنی سخت گیر حکمت عملی اور غیر انسانی ہتھکنڈوں کے استعمال کے لیے دنیا میں معروف ہے)۔ اس رپورٹ کے باعث اس معاملے کو تشہیر تو بہت ملی لیکن دوسری جانب اس رپورٹ نے بش انتظامیہ اور اس کے حمایتیوں کے لیے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ بحث کا رخ اپنی پالیسیوں کی طرف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے جبکہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی تجزیاتی صلاحیت اور معتبر ہونا موضوعِ بحث بن گیا۔ اسی طرح ہیومن رائٹس واچ (Human Rights Watch) نے امریکی حکمتِ عملیوں اور قیدیوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی سے متعلق متعدد رپورٹیں جاری کیں تاکہ آزادانہ تفتیش ہو سکے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ پھر مرکز برائے دستوری حقوق (The Centre for Constitutional Rights) نے بعض سابق قیدیوں کی معاونت سے آفاقی دائرہ اختیار کے اصول پر جرمن عدالت میں سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ اور ان کے دیگر رفقاء کے خلاف مقدمہ دائر کیا جسے بہر حال جرمن حکام نے خارج کر دیا۔

غیر حکومتی اداروں کی ان سرگرمیوں کو جب ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں اور کانگریسی کارروائیوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس نے بش انتظامیہ پر جبری اور سخت گیر تفتیش کو محدود رکھنے کے لیے شاید ہی کوئی دباؤ ڈالا ہو۔

عالمی ریڈ کراس کمیٹی

گٹمو، افغانستان اور عراق میں ہونے والے واقعات کی تفصیل امریکی حکومت کے علاوہ اگر کوئی ادارہ جانتا ہے تو وہ عالمی ریڈ کراس کمیٹی ہے۔ یہ ادارہ دنیا میں ہونے والے مسلح تصادم اور داخلی بدامنی پر

بطور خاص نظر رکھتا ہے۔ انسانیت کا تحفظ اس کے منشور کا حصہ ہے۔ جنگوں اور بدامنی کے حالات میں پکڑے جانے والے قیدیوں کے انسانی وقار کو برقرار رکھنا اس ادارے کا مطمع نظر ہے۔ تیسرے اور چوتھے جنیوا کنونشن کے تحت کسی بھی عالمی مسلح تصادم کے قیدیوں کے احوال جاننے کا اختیار اس ادارے کو حاصل ہے تاکہ اس بات کا مشاہدہ حاصل کر کے اس پر تبصرہ کر سکے کہ آیا عالمی قانون برائے انسانیت (IHL) پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں؟ اسے خانہ جنگی اور داخلی بدامنی کے دوران اپنی خدمات پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ ایسی صورت میں اس کے دوروں کا عمل کم وبیش اسی طرح ہوگا جس طرح عالمی جنگوں میں ہوتا ہے۔

اگرچہ بش انتظامیہ گٹمو میں عالمی قانون برائے انسانیت کے عدم اطلاق پر اصرار کرتی رہی تاہم ۲۰۰۲ء کے اوائل سے عالمی ریڈ کراس کمیٹی کو مستقل موجودگی کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ ابھی تک واضح نہیں ہوسکا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ کیونکہ اسی دوران بش ٹیم نے جبری تفتیش کی حکمت عملی پر عمل درآمد شروع کر دیا جو متعلقہ عالمی معیار کے منافی تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ عالمی ریڈ کراس کمیٹی رازداری کو ترجیح دیتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے توسط سے غیر انسانی حکمتِ عملی کا چہرہ خوشنما اور مہذب سرگرمیوں سے سجا دیا جائے، یہ سوچتے ہوئے یہ سخت تبصروں کو بآسانی نظرانداز کر دے گی۔ آخر عالمی ریڈ کراس کمیٹی ۱۹۶۷ء سے اسرائیل اور دیگر مقبوضہ علاقوں میں موجود چلی آ رہی ہے اور پھر بھی بعض فلسطینی قیدیوں کے خلاف اسرائیلیوں کی بدسلوکی بہت معروف ہے یا کم از کم ۱۹۹۹ء تک ضرور تھی جب اسرائیل کی عدالتِ عظمیٰ نے ''معتدل'' جسمانی اور نفسیاتی دباؤ یا ہلکے تشدد کو ممنوع قرار دے دیا۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واشنگٹن یہ چاہتا ہے کہ عالمی ریڈ کراس کمیٹی اس کی نپی تلی اور محدود جبری تفتیش کی حکمت عملی کی جانچ پڑتال ایک آزاد ادارے کے طور پر کرے اور واشنگٹن کو یہ بتا سکے کہ کب معاملات غلط رخ اختیار کر رہے ہیں یا قابو سے باہر ہو رہے ہیں لیکن اس طرح نہیں کہ انتہائی اہم قیدیوں کی مفید تفتیش میں دخل اندازی شروع کر دی جائے۔ آخر بش انتظامیہ متعدد امور میں سرخرو ہوئی ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ یہ ادارہ خاموش رہ کر اپنی خدمات انجام دیتا رہے اور بعض خرابیوں کی نشان دہی کے بعد صرفِ نظر سے کام لے۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گٹمو میں ۲۰۰۲ء کی سرگرمیوں کے دوران واشنگٹن نے قیدیوں سے باقاعدہ بدسلوکی کا

رویہ بتدریج اختیار کیا ہو اور اس حکمت عملی کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں ابھی پوری طرح فیصلہ نہ کر پایا ہو اور اسی عرصے میں عالمی ریڈ کراس کمیٹی کو وہاں کے دورے کی اجازت دے دی گئی ہو۔

عالمی ریڈ کراس کمیٹی نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ عالمی قانون برائے انسانیت (IHL) کا اطلاق کم از کم گٹمو کے بعض قیدیوں پر نہیں ہوتا تاہم اپنی ترجیحی پالیسیوں پر قائم رہتے ہوئے اس ادارے نے عوامی سطح پر اس طویل اور ترش بحث میں پڑنے سے گریز کیا، خاص طور پر اس لیے کہ وہ گٹمو میں براہ راست انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق امور میں مصروفِ عمل تھا۔

مئی ۲۰۰۳ء میں عالمی ریڈ کراس کمیٹی نے گٹمو میں موجود قیدیوں پر فردِ جرم عائد کیے بغیر غیر معینہ مدت قید کے مضر اثرات کا تذکرہ عوامی سطح پر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کام انتہائی مناسب طریقے سے ایک دھیما لب ولہجہ اختیار کرتے ہوئے کیا گیا جو اس ادارے کا مخصوص انداز ہے۔ گٹمو میں موجود تیس (۳۰) سے زائد قیدیوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ ان کی مایوسی بتائی جاتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ امریکہ عالمی ریڈ کراس کمیٹی کو مالی امداد فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے، (خصوصاً ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۵ء میں) امریکہ نے ادارے کو عالمی سطح پر امدادی کارروائیاں کرنے کے لیے اس کے اخراجات کا تقریباً ۲۸ فیصد امداد کے طور پر دیا۔ تاہم یہ امداد ادارے کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہو سکی اور نہ ہی اس امدادی حجم کا ''اٹاوہ معاہدے'' (Ottawa Treaty) کی حمایت پر کوئی اثر پڑا، جس میں فرینکن میں زمینی بارودی سرنگیں بچھانے پر پابندی عائد کی گئی تھی اور امریکہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔

یہ واضح ہے کہ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۴ء کے دوران عالمی ریڈ کراس کمیٹی نے گٹمو میں امریکی حکمت عملیوں سے متعلق نجی طور پر متعدد احتجاج رقم کرائے تھے۔ مثلاً کم سن قیدیوں (۱۸ سال سے کم عمر) سے زیادتی، جانماز اور قرآنی نسخوں کی کمی، تفتیشی افسران کی طرف سے قرآن مجید کی بے حرمتی، قیدیوں کی جنسی تذلیل، تفتیشی افسران کی طرف سے ایسے طبی کوائف کا استعمال جو طبی اخلاقیات کے منافی ہے اور بعض دیگر امور میں ایسی امریکی سرگرمیاں جو تشدد کے زمرے میں داخل ہیں۔ بعض اوقات عالمی ریڈ کراس کمیٹی کو کچھ قیدیوں کے ساتھ ملاقات کرنے سے روکا گیا۔ بعض معاملات میں ادارے کے نمائندگان نے صورت حال کی سنگینی کو بھانپ کر احتجاجاً اپنے دورے منسوخ کر دیے تاہم ان موقعوں پر

عوامی حلقوں کے لیے کوئی بیان جاری نہیں کیا گیا۔

عالمی ریڈ کراس کمیٹی کے صدر جیکب کیلن برگر (Jakob Kellenberger) تین دفعہ واشنگٹن گئے اور فروری ۲۰۰۵ء میں صدر بش سمیت انتظامیہ کے متعدد سینئر افسروں سے ملاقاتیں کیں اور گٹمو، افغانستان اور دیگر معاملات پر گفت وشنید کی۔ کیلن برگر نے گٹمو اور عالمی قانون برائے انسانیت (IHL) سے متعلق معاملات پر جنیوا میں تعینات امریکی سفارتی مشن سے مستحکم انداز میں مذاکرات جاری رکھے۔ یوں عالمی ریڈ کراس کمیٹی کی ہائی کمان کی خاموش سفارت کاری کا عمل جاری رہا جس کا مطمع نظر یہ تھا کہ امریکی حکمت عملی میں ایسی مؤثر تبدیلیاں لائی جاسکیں جو انسانی وقار کی سربلندی کے معروف عالمی معیار سے ہم آہنگ ہوں۔

حالانکہ بیرونی مبصرین یہ نہیں جانتے کہ گٹمو میں کتنی بہتری آئی ہے اور حل طلب مسائل کے اعداد وشمار کیا ہیں؟ اور نہ ہی وہ جانتے ہیں کہ عوامی احتجاج کے ختم ہو جانے یا جاری رہنے کی صورت میں عالمی ریڈ کراس کمیٹی کو اپنے امور کی انجام دہی میں حقیقتاً کیا فائدہ یا نقصان ہوگا۔ قرآن مجید کی بے حرمتی سے متعلق رپورٹیں غالباً ۲۰۰۳ء کے وسط میں ختم ہوگئی تھیں اسی طرح تفتیش کے لیے خواتین اہلکاروں کا استعمال اور قیدیوں کی جنسی تذلیل پر مبنی سرگرمیاں بھی ختم ہوگئیں تھیں۔ شاید اس لیے کہ ان سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ ۲۰۰۵ء تک گٹمو تھوڑی بہت نئی تفتیش یا قیدیوں کی رہائش کے ایک مرکز سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

ہم یقیناً یہ نہیں جانتے کہ آیا عالمی ریڈ کراس کمیٹی نے گٹمو کے قیدیوں سے یہ کہا کہ وہ اپنا احتجاج ختم کر دیں یا جاری رکھیں۔ یہ ادارہ بعض اوقات قیدیوں سے سوال پوچھتا ہے اور اگر قیدی اس بات کی خواہش کا اظہار کریں کہ ادارہ اس علاقے کے خفیہ دورے کرتا رہے کہ یہی ان کا باہر کی دنیا کے ساتھ واحد رابطہ ہوتا ہے، تو یہ ادارہ اس خواہش کو ضرور پورا کرتا ہے، خواہ انسانیت کے تحفظ کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی کیوں نہ ہو!

بعض مبصرین کے مفروضوں کے برعکس گٹمو میں وقت کے ساتھ ساتھ بعض بہتر تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں، جسے عالمی ریڈ کراس کمیٹی کی خاموش سفارت کاری کے پردے میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن

باہر کے لوگ اس تبدیلی کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔

عراق میں جہاں امریکہ عالمی قانون برائے انسانیت کے قابل اطلاق ہونے کو تسلیم کرتا ہے، جیل میں قیدیوں تک رسائی کا عمل گٹمو سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ عالمی ریڈ کراس کمیٹی کے ایک رکن کو ۲۰۰۳ء کے موسم گرما میں جان بوجھ کر قتل کیا گیا، اور اسی کے نتیجے میں اس کے ہیڈ کوارٹر پر بھی بغداد میں حملہ کیا گیا۔ ان وجوہات اور عراق میں عدم تحفظ کی عمومی صورتحال کے پیش نظر ادارے نے اردن سے اپنی ایک ٹیم عارضی طور پر بلوائی۔ اس کے باعث کچھ مشکلات پیش آئیں خصوصاً قیدیوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں تاخیر ہوئی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جنیوا نے ۲۰۰۳ء کے اواخر میں عراق میں ہونے والی پیش رفت کو گٹمو، یا افغانستان کے مقابلے میں بہتر قرار دیا۔ اعلیٰ حکام نے ابوغریب میں بدسلوکی کی زیادہ اجازت نہیں دی تاہم حقیقت میں صحیح منصوبہ بندی اور نگرانی میں بہت غفلت برتی۔ اس لیے امریکی حکام نے ریڈ کراس کمیٹی کی طرف سے تجویز کردہ تبدیلیوں میں کوئی خاص رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ تاہم جان بوجھ کر بھی بدسلوکی کی حکمت عملیاں اختیار کی گئیں۔ مثلاً سی آئی اے کا لوگوں کو غائب کر دینا، جن میں زیادہ تر بدسلوکی کا نشانہ بنے تھے اور ان میں سے کم از کم ایک قید کے دوران جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ریڈ کراس کمیٹی کی سفارشات پر امریکی عمل درآمد بہت سست ہوتا تھا اور ایک موقع پر امریکی افسر کی طرف سے یہ تجویز کیا گیا کہ ریڈ کراس کمیٹی کے دورے کی اطلاع پیشگی ہونی چاہیے تاکہ جبری تفتیش میں مداخلت نہ ہو سکے۔

ان حالات میں عراق اور جنیوا سے متعلق ریڈ کراس کمیٹی کے اہلکار یہ چاہتے تھے کہ ان کے دوروں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ وہ عوامی سطح پر مؤثر احتجاج کے خواہش مند تھے لیکن ادارے کے ہیڈ کوارٹر میں ایک بار پھر محتاط غور وفکر کے بعد خاموشی سے کام جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ کمیٹی کی ایک خفیہ رپورٹ ''وال سٹریٹ'' جریدے میں شائع ہوگئی تاہم یہ ادارے کے ذرائع سے نہیں بلکہ بعض امریکی ذرائع کی وساطت سے شائع ہوئی اور اس کے منفی اثرات امریکی حکام کی طرف سے سامنے بھی آئے لیکن اس سب کے باوجود ادارے کی حکمت عملی میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ پھر جب فروری ۲۰۰۵ء میں کیلن برگر کی بش، رمزفیلڈ اور نائب صدر سمیت دیگر حکام سے ملاقاتیں ہوئیں تب بھی گٹمو اور افغانستان کے

مقابلے میں عراق کو بہرحال ترجیح نہیں دی گئی۔ عراق میں بعض تبدیلیاں اس وقت آئیں جب ابوغریب جیل کی کچھ بدنام زمانہ تصاویر منظر عام پر آئیں اور یہ بھی ادارے کی جانب سے میڈیا تک نہیں پہنچی تھیں۔ بہرحال گٹمو کی طرح عراق میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی کا عمل شروع ہوا اور بالآخر بہت سے غیر جنگی قیدیوں کو رہائی ملی۔

افغانستان کے مختلف مقامات مثلاً بگرام، قندہار یا دیگر چھوٹے عسکری مراکز میں قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی رپورٹیں موجود ہیں۔ اس بدسلوکی کے نتیجے میں کم از کم بیس اموات ایسی تھیں جن کی تحقیق زیر نظر مضمون لکھے جانے کے وقت ہو رہی تھیں۔ ابتدا سے ہی ریڈ کراس کمیٹی کی رسائی تمام حراستی مراکز میں موجود سارے قیدیوں تک ممکن نہیں بنائی گئی تھی۔ افغانستان میں قیدیوں سے متعلق امریکی حکمت عملی ریڈ کراس کمیٹی کی خصوصی توجہ اور کاوشوں کا محور رہی ہے۔

خلاصہ

یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ امریکی حکومت کسی دوسری ریاست سے تشدد کے متعلق خاموش سفارتکاری کی کوشش کرے گی تو اسے ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پڑے گا جیسا کہ ایک برطانوی سفارت کار کو تجربہ ہوا جب اس نے جرمن عسکری کیمپوں سے متعلق نازی حکام کے ایک اہلکار سے بات کی تو نازی اس پر پھٹ پڑا اور بوئر کی جنگ (Boer War) میں برطانوی عسکری کیمپ کا حوالہ دیا، جہاں تقریباً ۳۰ ہزار افراد موت کی نیند سلا دیے گئے تھے جن میں اکثریت خواتین اور بچوں کی تھی۔

لیکن امریکی سیاست کا تھوڑا سا جھکاؤ اس تجویز کی طرف دکھائی دیتا ہے جو ''تحفظِ حقوقِ انسانی'' کی طرف سے آئی ہے۔ اس کے مطابق خصوصی استغاثہ قائم کیا جائے یا خصوصی کمیشن بٹھایا جائے جو قیدیوں سے بدسلوکی کی شروعات یا بنیاد کا جائزہ لے اور اعلیٰ ترین سطح پر سول اور فوجی دونوں طرح کے ذمہ داراوں کا تعین کرے جو اب تک بے گناہ سمجھے جا رہے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد امریکی قوم میں رواداری ماضی کے مقابلے میں کم ہوئی ہے لیکن اس کا سبب شاید کھلی اور جارحانہ بحث کا فقدان اور بش کی سکیورٹی پالیسی سے متعلق پایا جانے والا اختلاف رائے ہے۔

چنانچہ اس کے باوجود جبری تفتیش پر مبنی اس پالیسی کو بش انتظامیہ نے مستقل مزاجی سے چلایا اور اس پر قائم رہی تاہم اس کے لیے فوجی مراکز میں جاری رہنے والی تفتیش کو ختم کرنا پڑا۔ عالمی تنقید کی اہمیت داخلی پہلوؤں کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہوتی البتہ عالمی ریڈ کراس کمیٹی کا کردار کم اہم نہیں ہے۔

صورتحال کلیتاً نئی نہیں ہے اور محض فرانس-الجیریا کے مواز نے سے ہی نہیں بلکہ اگر سرد جنگ کے حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اس دور میں امریکہ آزادی، انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کا علمبردار تھا لیکن در پردہ منتخب جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹتا رہا اور خونی ساتھیوں کا اتحادی بنا رہا مثلاً چلی (Chile) اور گوئٹے مالا (Guatemala) میں امریکی کارروائیاں تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر امریکیوں کو محبِ وطن بننے کے لیے اتنی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟